فلسفۂ انائے مطلق

ھُو

میر احمد نوید

کیا، کیوں

خلق کرکے عقل کو ''کیوں'' اور ''کیا'' کیوں ہوگئے
یہ مجھے بندہ بنا کر تم خدا کیوں ہو گئے

کھلے جاتے ہیں ''کیوں'' اور ''کیا'' سے دل پر بھیداشاء کے
نہیں کھلتا مگر دل پر یہ ''کیوں'' کیا ہے یہ ''کیا'' کیا ہے

تو کیا یہ ''کیوں'' نہیں ہوتا یہ ''کیا'' نہیں ہوتا
اگر نہ ہوتی خودی کیا خدا نہیں ہوتا

کچھ تو ہوتے نگاہ میں اپنی
''کیوں'' نہیں ہوتے ''کیا'' نہیں ہوتے

جب ابتدا بھی ''کیا'' ہے یہاں انتہا بھی ''کیا''
ادراک میں کسی کے پھر آئے خدا بھی کیا

پوشیدہ ہر سوال تھا بس اک سوال میں
میں ''کیوں'' سے جب گزر گیا ''کیا'' سے گزر گیا

انسان ہی مَرا نہ خدا ہی مَرا نوؔید
خود تیرے ''کیوں'' کے ساتھ ترا ''کیا'' بھی مر گیا

رخصت ہوا جو ''کون'' تو ''کیوں'' بھی چلا گیا
ساتھ اپنے لے کے ''میں'' کو یہ ''ہوں'' بھی چلا گیا

''کیا'' ڈھونڈنے میں ''لا'' کا سوال آ گیا ہوگا
ممکن سے گزر کر تو محال آ گیا ہوگا

ہے ''کیا'' کی ستائی ہوئی ماری ہوئی ''لا'' کی
پھر بھی یہ خلش کوئی خدا مانگ رہی ہے

''کیا'' سے بھی پہلے ہے درکار مجھے اِس کا جواب
یہ بنانا ہے کہ یہ عقل میں آنا ہے سوال

تجھ کو بننا ہے اگر حق القیں تو کر سوال
''کیا'' نے ''کیوں'' کی خاک سے تیرا جہاں پیدا کیا

ترے خمیر میں ''کیا'' اور ''کیوں'' اِسی لیے ہیں
مل آ کے ہم سے کہ ''لا'' ہے ہماری تنہائی

''کیا'' کو عالم کا تماشا ہی نہیں چاہیے ہے
''کیوں'' کا مطلب ہے کہ ہونا ہی نہیں چاہیے ہے

شعورِ عشق! حیرت کے سوا بھی مسئلہ ہے
یہ ''کیوں'' بھی مسئلہ ہے اور یہ ''کیا'' بھی مسئلہ ہے

یہ ''کیوں'' کہاں سے بھلا فرض کر لیا تُو نے
یہ ''کیا'' کہاں سے لیا ''کیا'' سے تیری کیا ہے مُراد

تجھے خبر ہے تیرے ''ہے'' کی حد کہاں تک ہے
مجھے خبر ہی نہیں میرے ''کیا'' کی حد کیا ہے

اک ''کیوں'' سے جو اک ''کیوں'' کا ہے دوران وہ ہستی
اک ''کیا'' سے جو اک ''کیا'' میں ہے وقفہ وہی ہوں میں

جو ہے ، جو نہ ہوگا ، جو نہیں تھا ، وہی ہوں میں
کیا ہُوں میں جو اک ''کیا'' کا ہے نشہ وہی ہوں میں

بکھرا تو بس اک ''کیا'' کے سوا کچھ بھی نہیں تھا
شیرازہ تھا میں اپنے بکھر جانے سے پہلے

جز خامشی جواب نہیں کوئی میرے پاس
وہ پوچھ لے اگر کہ ہے مفہوم ''کیا'' سے کیا

تیری خبر نہ کچھ اپنا پتا یہ لگتا ہے
کہ ایک ''کیا'' نے بس اک اور ''کیا'' بنایا ہے

''لا'' پہ پردہ پڑا ہے ''کیا'' چپ ہے
کیوں نہ میں چُپ ہوں جب خدا چُپ ہے

''کیوں'' سا رہتا ہے ''کیا'' سا رہتا ہے
دل جو کھویا ہوا سا رہتا ہے

''کیوں'' نظر آنے لگا ''کیا'' نظر آنے لگا ہے
اب تو ہونا بھی تماشا نظر آنے لگا ہے

''کیوں'' کا کیا راز ''کیا'' کا کیا مقصد
اے خودی معنی اے خدا مقصد

اُلٹ کے دیکھا یہ ''کیا'' اور پُلٹ کے دیکھا یہ ''کیوں''
ملا تو پھر وہی ''کیوں'' اور ملا تو پھر وہی ''کیا''

جس لمحے تجھے تیرا پتا مل گیا ہوگا
''کیوں'' مل گیا ہو گا تجھے ''کیا'' مل گیا ہوگا

آپ کو زندگی و موت سے کیا لینا ہے
جنہیں ''کیوں'' چاہیے ہوتا ہے وہ ''کیا'' ڈھونڈتے ہیں

کچھ ہو کہ نہ ہو دہر کی بنیاد میں لیکن
''کیوں'' ہے کہ نہیں ہے کہو''کیا'' ہے کہ نہیں

زندگی ''کیا'' ہے زندگی ''کیوں'' ہے
سوچ کر مر نہ جایئے صاحب

کیا لکھوں میں کہ جب خدا کی جگہ
''کیوں'' لکھا جائے ''کیا'' لکھا جائے

وہم کی کیا یہی حقیقت ہے
مثل میں ''کیوں'' مثال میں ''کیا'' ہے

تم ہو کہ تم نہیں ہو بس یہ سوچو
کیا سوچنا کہ ''کیا'' ہے ''کیا'' نہیں ہے

اب بے بسی میں دوڑتا رہ ''کیا'' سے ''کیوں''تلک
حسرت ہے آئینے کی تو حیرت کو اب نہ رو

صفر کچھ ہے نہ لا کچھ ہے نہ کیوں کچھ ہے نہ کیا کچھ ہے
ہے عقلِ خواہ بھی فارغ دلِ ناخواہ بھی فارغ

''کیا'' سے ڈھانپا ہوا میں ''کیوں'' میں دبایا ہوا میں
صاف ظاہر ہے ہوں باطن میں چھپایا ہوا میں

حیرت ہو ابتداء نہ کیوں حیرت ہو انتہا
''کیا'' اور ''کیوں'' بنے ہیں جو وجہِ بنائے صفر

سوال اپنے اپنے جواب اپنے اپنے
یہ ''کیوں'' اپنا اپنا یہ ''کیا'' اپنا اپنا

ہے عقل تیری نشّے میں ''کیا'' اور ''کیوں'' کے دُھت
''کیوں'' ہے یہاں نہ ''کیا'' ہے تیری آنکھ بند ہے

بے دِلی جانیے یا کہیے اِسے سرشاری
اب نہ ''کیا'' کی کوئی خواہش ہے نہ ''کیوں'' کی حسرت

ہے اور نہیں

''ہے'' کی کیا ہست کیا ''نہیں'' کی نیست
ہم نہ ہوتے تو کیا نہیں ہوتے

پوشیدہ گر ہے حرف کی صورت ''نہیں'' میں ''ہے''
منظور اِس حجاب سے پردہ کچھ اور ہے

یہ کیا ہُوا نہیں کا نہیں ڈھونڈنے میں ہائے
وہ کام آپڑا ہے کہ فرصت کہیں جسے

دیکھا ہے یہ ''نہیں'' سے گزر کر بہ شدّ و مد
یاں کچھ عدم نہیں ہے یہاں سب وجود ہے

اٹھے تھے ''ہے'' سے جو زندہ مگر ''نہیں'' میں رہے
شعورِ ''لا'' تھے کسی ذہنِ آتشیں میں رہے

ہر نفس ''ہاں'' اور ''نہیں'' کے درمیاں میں بھی تو ''ہُوں''
اے یقین میں بھی تو ہُوں ہاں اے گماں میں بھی تو ہوں

سوائے ہاتھ شل ہونے کے اپنے ہاتھ کیا آیا
کہ ''ہے'' بھی کھودیا ہم نے کہ ''تھا'' بھی کھودیا ہم نے

''ہے'' بھی میرے خیال میں ''نہیں'' ہے
جانے تیرے خیال میں کیا ہے

''ہے'' کو ''نہیں'' بنا کے بنا کے ''نہیں'' کو ''ہے''
دریا کو قطرہ ، قطرے کو دریا کیا گیا

وہ کشاکش ہے کہ آتا ہے نہ رکتا ہے یہ دم
کبھی کرتا ہوں ''نہیں'' اور کبھی ''ہاں'' کرتا ہوں

پھر اُس کے بعد نہ ''ہے'' تھا نہ تھا ''نہیں'' کوئی
جو اپنی بے خبری کی خبر ہوئی ہم کو

یہیں ہے جلوۂ یکتائی احد کا غیاب
''نہیں'' میں ''ہے'' کا سرا ہے ہماری تنہائی

خدا ''نہیں'' کہ خدا ''ہے'' مجھے نہیں معلوم
کہاں تلک یہ خلا ہے مجھے نہیں معلوم

او بے خبر ترے '' ہے '' اور ''نہیں'' سے کیا ہوگا
کہ بے تضاد ہے بنیادِ عنصرانِ تضاد

ہونا نہیں ہوں میں کہ نہ ہونا نہیں ہوں میں
یعنی ''نہیں'' کا ''ہے'' ہوں نہ ''ہے'' کا ''نہیں'' ہوں میں

تنہائی کو نہ جانے ہو یکتائی کب نصیب
اب تک تو ''ہے'' کی قید سے نکلا نہیں ہوں میں

''ہے'' سے بھی نکل جا تو ''نہیں'' سے بھی نکل جا
پھر تیری بلا سے تجھے کیا ''ہے'' کہ ''نہیں'' ہے

کیوں سوچوں خدا ''ہے'' خدا ''نہیں'' ہے
یعنی یہ مِرا مسئلہ نہیں ہے

آپ ''ہے'' اور ''نہیں'' کی ہیں ہر سمت سے ماورا
کیا اِدھر کیا اُدھر کیا جدھر کیا کدھر ''آپ ہیں''

ہمیشہ کے لیے ''ہے'' اور ''نہیں'' سے جان چھٹ جاتی
گزر جاتے وہ ہر تقویم وساعت سے گزر جاتے

وہم اور حقیقت

کوئی تو ٹھہرے کہ پُوچھیں یہ گزرنے والے
وہم کس چیز کو کہتے ہیں حقیقت کیا ہے

پردے میں وہم کے ہے حقیقت خدا گواہ
گھیرے ہے آئنے کو یہ حیرت خدا گواہ

گوندھا گیا کچھ ایسے حقیقت کو وہم میں
پنہاں کیا گیا کبھی پیدا کیا گیا

ثبوتِ وہم میں ہر گز نہ لا حقیقت کو
بیان کرنے کو ممکن، محال پر مت جا

جو اک لمحہ ہُوا ہوگا بسر، فکرِ حقیقت میں
اُس اِک لمحے میں صدیوں کی عبادت ہوگئی ہوگی

ابھی تو وہم ہی معنی طلب ہے
اور اُس پر میں، حقیقت چاہتا ہوں

اے محوِ خواب، تیری حقیقت بھی خواب ہے
تو، وَا سمجھ رہا ہے، تری آنکھ بند ہے

ہے فارغ جلوۂِ وہم و حقیقت چاہ بھی فارغ
جنوں احساس بھی فارغ خرد آگاہ بھی فارغ

سوائے وہم نہیں کچھ نہیں وجود کا ''لا''
نہ کر خیال کا پیچھا خیال پر مت جا

درحقیقت وہ ترا وہم بھی ہو سکتا ہے
جس کو تو عشوہ و انداز و ادا سمجھا ہے

نہ ہے حقیقتِ وہم اور نہ ہے حقیقتِ خواب
شراب لاؤ! کہاں کا سبق کہاں کی کتاب

ہر حقیقت ہے یہاں نقطۂ موہوم میں گم
نہیں معلوم کہ موہوم سے آگے کیا ہے

کس طرح پھر اظہار میں ابہام نہ آئے
مبہم کو مری چشم نے مبہم ہی تو دیکھا

یہاں معلوم حقیقت ہے فقط نامعلوم
مجھ کو تو بس یہی معلوم نظر آتا ہے

وجہِ پیدائیِ حقیقت ہے
کچھ اگر ہے حقیقتِ اوہام

بھلا ہُوا کہ حقیقت نے کردیا بیدار
وگرنہ خواب میں ہوتا کہاں ہے خواب کا ہوش

وہ جس لمحے تجسس سے تجسس اٹھ گیا ہوگا
حقیقت ہاتھ آکر بے حقیقت ہو گئی ہوگی

اے محوِ خواب تیری حقیقت بھی خواب ہے
تو وا سمجھ رہا ہے تیری آنکھ بند ہے

وہ کون ہے جو حقیقت کو جانتا ہے یہاں
تو کیا ہوا جو تمہیں بھی اگر نہیں معلوم

گوندھا گیا کچھ ایسے حقیقت کو وہم میں
پنہاں کیا گیا کبھی پیدا کیا گیا

وہم آیا ہے حقیقت کو برہنہ کرنے
یا اسے اور چھپانے کے لیے آیا ہے

یا عقل سے سوچا نہ گیا عقل سے آگے
یا کھل نہ سکا وہم حقیقت سے زیادہ

عشق

انتہا کوئی نہیں ہے ابتدا ہونے کے بعد
عشق کیا ہے جان لو گے مبتلا ہونے کے بعد

تم عشق کا خچر کہ گدھا عقل کا لاؤ
ہم مست ہیں ہم کو کہیں جانا ہی نہیں ہے

بندگانِ عشق کی بے چارگی سے کیا غرض
حسنِ بے پروا کو ہے اپنے خدا ہونے سے کام

اٹھتا ہے تیرے لمس میں بیدار ہو کے دن
چلتی ہے تیرے عشق کی خوابیدگی میں رات

میں جاں سے وہ آئینۂ خود بینی سے گزرا
اب حُسن ہوا میری محبت کے برابر

کہہ رہا ہے یہ جلال، کہہ رہا ہے یہ جمال
عشق کو نہیں زوال حُسن کو نہیں زوال

میں ہوں خود ہی آئنہ میں ہوں خود ہی حیرتی
عشق یعنی میری تاب حُسن یعنی میرا حال

عجب ہے عشق عجب عشق کی اذیّت ہے
نہ رُک رہا ہے وہ خنجر، نہ کٹ رہا ہے گلو

تُو مردِ عشق اناالحق تری نوا سائیں
خدا نہیں پہ خدا سے نہیں جُدا سائیں

تجھے خبر نہ ہوئی ''تُو'' سے کب ہوا ''میں'' تُو
رہا تُو مستِ مئے ساغرِ الٰہ سائیں

وہ تُو کہ آپ ہی عاشق ہے آپ ہی معشوق
ملے گا اور کہاں تجھ سا مبتلا سائیں

تُو عشق تھا بہ خدا حُسن ہوگیا آخر
وہ ابتدا تھی تری یہ ہے انتہا سائیں

نوؔید بھی ہے مسافر رہِ انالحق کا
یہی ہے وقت کچھ اُس کے لئے دُعا سائیں

جو چشمِ عشق تہہِ بارِ آئنہ ہے تو یہ
سزا ہے یا کہ جزا ہے مجھے نہیں معلوم

دین بھی کم ہے جسے کم ہے یہ دنیا جس کو
کم ہیں یہ عشق و ہوس جس کو وہ شدّت کیا ہے

چلی ہے سمتِ مخالف میں طبعِ ماہیِ عشق
ہے کتنا دَم ترے آبِ رواں میں دیکھنا ہے

قیمتِ عشقِ زلیخا نہیں معلوم مگر
حُسنِ یوسفؑ ہے ٹکے کا جو زلیخا ہی نہ ہو

ہے حُسن کیا وجود کے ہونے کا ایک وہم
ہے عشق کیا نہ ہونے کی وحشت خدا گواہ

خبط و گمان و وہم و شک ، ریگ و غبار و گرد و خاک
عقل کی فتح کچھ نہیں عشق کی مات کچھ نہیں

اپنے یقین کی قسم اپنے گمان کی قسم
عشق کا دام کچھ نہیں عقل کی گھات کچھ نہیں

اِس عشق کے ہونے سے ہے پردہ اُسے در پیش
یہ عشق نہ ہوتا تو یہ پردہ بھی نہ ہوتا

کچھ نہیں مقصودِ چشمِ عشق حیرت کے سوا
آنکھ جو رکھتا ہے اُس کا مدّعا ہے آئینہ

یہ عشق کی ہے کرامت کہ ہے کرامتِ تیغ
کہاں جُدا ہُوا شانے سے سر نہیں معلوم

عاشق ہوں مِرے تن سے جھلکتا ہے وہ معشوق
یونہی تو دوانہ نہیں عالم مِرے دل کا

اک قہقہہ بر عشق تو اک قہقہہ بر حُسن
جاری ہے عجب گریۂ پیہم مِرے دل کا

دستِ عشّاق میں آئے تو مشیّت کی طرح
بیدِ مجنوں ہو کہ موسیٰ کا عصا بولتا ہے

مَیں بھی تو ہوں اک عشق میں پابندِ سلاسل
کیوں ہاتھ وہ پابندِ حنا ہو نہیں سکتا

ہم تحیّر زدہ ہیں بندۂ عشق
اور ہمارا خدا تحیّر ہے

مفت میں دل سی نقدی دیے جائیں گے
عشق کرنا ہے سو ہم کیے جائیں گے

کچھ خبر ہے یہ عشق کا ہے سفر
منہ اٹھائے کدھر کو جاتے ہیں

گوندھا گیا قیام و رکوع و سجود کو
جب عشق کے خمیر کو زندہ کیا گیا

میں تیرے عشق میں خود بن گیا ہوں تجھ جیسا
مگر میں کون ہوں میری مثال پر مت جا

بس ایک عشق کیا، عشق، ایک کام سے عشق
بس ایک کام کیا، ایک کام بھی نہ کیا

عشق نے مسندِ کُن مجھ کو عطا کی یعنی
عشق کے کام میں ہر کام سے آزاد ہوا

کیوں نہ فرشِ عشق پر، میں عقل کا ماتم کروں
تھی وہ سیرابی کہ جس کو تشنگی سمجھا گیا

سوائے عشق ہمیں اور کچھ نہیں آتا
سو مَر رہے ہیں، یہی ایک کام کرتے ہوئے

اس کے چہرے سے تو کُھلتا نہیں کچھ عشق کا حال
درد سمجھا ہے وہ غم کو کہ دوا سمجھا ہے

جنون، عقل، خرد، جذب، عشق، مستی ، ہوش
کسے خبر ہے کہ کیا ہے ہماری تنہائی

درمیاں عشق کے کیا سود و زیاں ہجر و وصال
اِس تصور کو تو آنا ہی نہیں چاہیے ہے

عشق کو اِس سے کیا حذر عشق کو اس کی کیا خبر
عشق سزا ہی کیوں نہ ہو عشق جزا ہی کیوں نہ ہو

عشق ہے سیلِ تند و تیز، عشق کو اِس سے کب گریز
عشق فنا ہی کیوں نہ ہو عشق بقا ہی کیوں نہ ہو

عشق خودی و بے خودی ، ہے صاحبی و بندگی
عشق طریقِ زندگی عشق بلا ہی کیوں نہ ہو

کہہ رہا ہے یہ جلالؔ کہہ رہا ہے یہ جمال
عشق کو نہیں زوال، حُسن کو نہیں زوال

میں ہوں خود ہی آئنہ میں ہوں خود ہی حیرتی
عشق یعنی میری تاب حُسن یعنی میرا حال

یہی عشق کا ہے اوّل یہی عشق کا ہے آخر
کہیں خود سے خود میں غائب کہیں خود میں خود سے حاضر

مجھی سے عشق کی خلوت مجھی سے جلوتِ حسن
نیاز بھی سبھی مجھ سے ہیں بے نیاز بھی میں

گر عشق کو مکتب میں ملے عقل کی تعلیم
اور عقل کو مکتب میں ملے عشق کا مضمون

پھر کوئی بتاؤ مجھے مکتب سے نکل کر
مجذوب نہ کیوں عشق نہ کیوں عقل ہو مجنون

جو بھی ہو اب عدم کی حقیقت کہ اہلِ عشق
ہے جس جگہ وجود وہاں تک تو آگئے

گر آئینے کو لگے وہ بھی زنگ ہوجائے
وہ روگ ہم کو خدا کی قسم لگا ہے میاں

میں بھی تو ہُوں اک عشق میں پابندِ سلاسل
کیوں ہاتھ وہ پابندِ حنا ہو نہیں سکتا

یہ دل کہاں وہ ناوکِ مژگاں کہاں اے عشق
حق زخم چھپانے کا ادا ہو نہیں سکتا

کس عشق میں ہوں کچھ نظر آتا نہیں جُو حسن
کس سطح پہ ہوں کچھ مجھے گہرا نہیں لگتا

ہم محرمانِ عشق کو نادان مت سمجھ
کچھ سوچ کر ہی ہم نے گنوائے ہیں دین و دل

عشق سے حسن جھلکتا نظر آتا ہے مجھے
رخِ مجنوں رُخِ لیلیٰ نظر آتا ہے مجھے

اتنا شفّاف ہے یہ آئینۂ کون و مکاں
سانس لیتا ہوں تو دھندلا نظر آتا ہے مجھے

وحشتِ عشق کہاں مِنّتِ آئینہ کہاں
یاں تو دیوار میں چہرہ نظر آتا ہے مجھے

وحشتِ عشق کا ساماں نہ ہوا تھا سو ہُوا
چاکِ دل تابہ گریباں نہ ہُوا تھا سو ہُوا

عشقِ خاموش کو مژدہ کہ بہ دستِ آتش
آپ تصویر کے شایاں نہ ہُوا تھا سو ہُوا

جس حسن کا عاشق ہوں میں اُس حُسن کو میں نے
بے منّتِ آئینہ سنورتا ہوا دیکھا

میانِ عشق وہ گم کردہ راہ ہُوں کہ مجھے
خود اپنے آپ میں کھویا ہُوا مِلا ہے یہ دل

لَوٹ آئے اہلِ عشق یہ بازار گھوم کر
جو چاہیے ہے اُس کی دکاں کوئی بھی نہیں

حُسن کو خود میں بھر لیا مَیں نے
عشق میں یہ کمال میرا ہے

یہ بار بارِ عشق ہے اے ناتوانِ عشق
یہ بار اُٹھ گیا تو کوئی بار پھر نہیں

کاسۂ عشق بڑھاتا ہے کہ جاں دیتا ہے
واقفِ قیمتِ لیلیٰ ہوا سائل نہ ہوا

اے عشق تِری حدِّ خدائی کو بھی چھولیں
اب دن ہی یہاں کتنے قیامت میں رہے ہیں

یہ شکل حُسن کی ہیبت سے زرد ہے کہ نہیں
یہ آنکھ عشق کی وحشت سے لال ہے کہ نہیں

کہیں مِلے تو وہ پوچھے بغیر رہ نہ سکے
کوئی کہو کہ ہمارا وہ حال ہے کہ نہیں

اِک عشق تھا اب راکھ ہوا خود نِگری میں
اب کچھ بھی نہیں ہے ترے قابل مِرے دل میں

آئینۂ خودبینی اُس کو بھی قفس ٹھہرا
تجھ کو بھی محبت نے رکھا تہہِ دام اے دل

نثار تجھ پہ لباسِ خزاں ، برہنۂ عشق
کفن بھی چاہے تو قامت ترا چھپا نہ سکے

تجھ میں وہ حسن ہے اے جاں کہ بجز عہدِ وفا
کوئی چارہ ہی نہیں تیرے گرفتار کے پاس

اِک عشق میں یہ عمر لٹائیں گے اور پھر
سوتے رہیں گے ایک ہی کروٹ لیے ہوئے

عشقِ بے تیشہ سے تا کوہِ گرانِ روز گار
کب یہ دن ہلکا تھا مجھ پر کب یہ شب بھاری نہ تھی

اب بھی مری رفتار وہی ہے مگر اے عشق
یہ کون سی منزل ہے کہ منزل نہ رہا وہ

ہاتھ آتی عوضِ عمر متاعِ یوسفؑ
خود کو یہ عشق جو ہم تابِ زلیخا کرتا

جامۂ اصلِ عشق ہُوں لیکن
آہ کیسا مَسَک رہا ہُوں میں

شک و یقیں، مجاز و حقیقت، جنون و عشق
کیا اِن کے درمیاں ہے پتا کچھ تھا کچھ نہ تھا

دار و زہراب و قفس، سنگ و تبر کیا کہیے
عشق میں فیصلہ ہونے کا مقام آ ہی گیا

عشق گر زمزمہ پیرائیِ جلوت ہے تو کیا
حسن آئینۂ خلوت ہے سنور جانے کو

حسن عریاں ہو تو پھر عشق میں رکھّا کیا ہے
یہ تجسس ہے فقط بندِ قبا رکھنے سے

ہاں وہ رسوائی تھی اِک عشق میں لُٹ جانے کی
اب جو عزت ہے وہ پندار بچا رکھنے سے

دیکھیے دُھلتا ہے کب تک داغِ ناکامیِ عشق
دیکھیے چلتا ہے کب تک اِس طرح رونے سے کام

جیب و داماں و گریباں، بخیہ و چاک و رفو
عشق کے اِک کام سے کتنے نکل آتے ہیں کام

قیمتِ عشقِ زلیخا نہیں معلوم مگر
حُسنِ یوسفؑ ہے ٹکے کا جو زلیخا ہی نہ ہو

ہونا تھا تو ہونا تھا کسی صاحبِ دل کو
اے عشق بتا تو مجھے کیوں ہوگیا آخر

یہ سر ہی بار ہے ہم اہلِ عشق کو تن پر
نہیں فراغ کے سر پر اُٹھائیں بارِ کُلاہ

ایسا گیا کہ پھر نہیں آئی کوئی خبر
دل سے کہا تھا عشق کا حاصل کہیں سے لا

یہ تیرے زرد رُو عریانیِ شمشیر کے عاشق
ہزار انداز سے اک منّتِ قاتل اٹھاتے ہیں

مجھ عشق کے گھائل کو اقامت کی نہ تھی تاب
جب اُٹھ نہ سکا طوف کو دَر چل کے خود آیا

اے بے بسیِ عشق ترے بس کے میں صدقے
پرواز جو مانگی کبھی پر چل کے خود آیا

وارفتگیِ عشق ہے یا ہے کششِ تیغ
یاں تیغ کھنچی اور وہاں سر چل کے خود آیا

مجھے ڈبوئے گا کیا قلزمِ تموّجِ وقت
میں خود کو عشق میں غرقاب لے کے آیا ہوں

نہ جانے حسن کی ہیبت نے کردیا کیا دم
قدم بھی عشق کے آہو سے رم کیا نہ گیا

ہاں جانتا ہے عشق کا سودا جو سر میں ہے
آگے کئی چلے گئے سَر مار مار کے

جھکنا کہ جھکانا ہے ترے حسن کی توہین
جھکنا کہ جھکانا ہے مِرے عشق کی تضحیک

ہم تو اِک عشق میں ہر کام بھلائے ہوئے ہیں
کارِ دنیا اِسی بگڑی نے بنائے ہوئے ہیں

معلوم تھا یہ عشق کو سر جانے سے پہلے
جینے کیلئے مرنا ہے مر جانے سے پہلے

بس ہوگیا ہوگا یونہی اُس بُت سے ہمیں عشق
کیوں پوچھتے ہو ہم سے کہ کیوں ہوگیا ہوگا

عشق گُزرا ہے خدا جانیے کس منزل سے
دلِ مضطر کو جہاں درد و دوا ایک ہوئے

یہ عشق حُسن نہیں جو ادا کا ہو محتاج
کہ بے حجاب و وسیلہ ادا ہُوا کہ نہیں

تجھ پر کُھلے گا منزلِ کُن سے گزر کے دیکھ
کس نے گزر کے عشق کا رستا بنادیا

پھر میرے بعد کس نے اُٹھایا، یہ بارِ عشق
پھر میرے بعد، طو ق و سلاسل کا کیا بنا

کیا آنے والوں کے لیے، آسان ہوگئی؟
پھر میرے بعد، عشق کی مشکل کاکیا بنا

شعورِ عشق نے سب چھین لی ہے عمر مِری
نظر تو آتا ہوں لیکن میں نوجواں نہ رہا

ہر بار تو دل ہارتا تھا شوق سے لیکن
اس بار محبت میں جگر ہار گیا دل

کیا ضروری ہے کہ اب عشق ترے گھر کے قریب
اپنے رہنے کو در و بام بھی تعمیر کرے

یہ کارِ عشق ہے رکھ اپنے انہماک سے کام
نہ دیکھ بگڑا ہوا کیا ہے کیا بنا ہوا ہے

بسی ہوئی ہے میرے عشق سے تِری خلوت
تِرا جمال مِرا آئینہ بنا ہوا ہے

رنگ جو حُسن پہ آیا ہے تو یہ جان کہ بس
عشق کا رنگ اُڑانے کے لیے آیا ہے

مستی ہوش و جذب و جلال و جنون و عشق
اے میرے یار کوئی تو شدّت بحال رکھ

حیرت کے دن گزر گئے وحشت بھی ہوچکی
اب کیا نیا کریں کہ محبت بھی ہوچکی

خدا کو جب خدا بننے سے فرصت ہوگئی ہوگی
ہوا تو اور کیا ہوگا محبت ہو گئی ہوگی

عشق کہتے ہیں کسے صرف سُنا ہے تم نے
ہم نے جھیلا ہے اِس آزار کو ہم جانتے ہیں

قائم ہیں یہ زمین و زماں بر بنائے عشق
جلوت سرائے حسن ہے خلوت سرائے عشق

آرائشِ جمال سے فرصت نہیں اُسے
ہم کو بھی کوئی کام نہیں ہے سوائے عشق

تشکیلِ حُسنِ ذات سے تکمیلِ حُسن تک
میں ہی سزائے عشق ہُوں میں ہی جزائے عشق

ہم بوالہوس تو خیر نہیں ہیں مگر یہ ہے
عریاں تھا یہ بدن جو نہ ہوتی قبائے عشق

عاشق کوئی نظر میں سمائے تو کچھ کہوں
کیا ابتدائے عشق ہے کیا انتہائے عشق

سیلِ جہاں میں خود کو ڈبونا بھی عشق ہے
ہونا بھی عشق اور نہ ہونا بھی عشق ہے

اے حُسن اب یہ خواب حقیقت سے جُڑ گیا
اب جاگنا بھی عشق ہے سونا بھی عشق ہے

کہتے ہیں ''مَیں'' کو ہستیِ آدم پہ داغ ہے
یہ داغ ہے تو اِس کا نہ دھونا بھی عشق ہے

دیکھو مجھے کہ عشق سے میں حُسن ہوگیا
عاشق خود اپنی ذات کا ہونا بھی عشق ہے

ہم کو معلوم نہیں تھا ہمیں ہو جائے گا عشق
ہم نے سوچا تھا سہولت سے گزر جائیں گے ہم

جنوں

جنوں خانے میں یہ ہونا نہ ہونا کون دیکھے گا
تماشا جس طرح سے میں نے دیکھا کون دیکھے گا

اے رشکِ جنوں، رشکِ خرد، رشکِ رہِ طُور
لو تم ہی اُٹھاؤ جو اُٹھے غم مِرے دل کا

وہ جو بخشی ہے جنوں نے مِری دیوانگی کو
چاک نے دی ہے وہ مستی نہ رفو نے دی ہے

عجب جنوں ہے کدھر دیکھیے نکلتا ہوں
یہ اپنے پیچھے نہ معلوم میں کدھر کو چلا

میں حال میں نہیں ہوں میرے حال پر مت جا
اسیرِ عقل جنوں کی مثال پر مت جا

دامِ ہستی میں نہیں آئے جو ہم اہلِ جنوں
پھر ہمارے سامنے کیا ہے فنا کچھ بھی نہیں

دل قصۂ مجنوں سے، جب اٹھنے لگے ہوں گے
پھر لے کے جنوں کوئی، مثال آ گیا ہوگا

یا طعنہ زناں، سنگ زناں، تھک گئے ہوں گے
یا تیرے جنوں میں ہی، سنبھال آ گیا ہوگا

میں حال میں نہیں ہوں میرے حال پر مت جا
اسیرِ عقل جنوں کی مثال پر مت جا

جنون، عقل، خرد، جذب، عشق، مستی ہوش
کسے خبر ہے کہ کیا ہے ہماری تنہائی

جنوں کی خیر منا اے جنونِ بے بنیاد
چلو، کہیں نہیں کوئی پری مگر فریاد

جب تھا جنوں تو سر کو میسر تھا سنگِ طِفل
اب کیا کریں کہ اب نہ جنوں ہے نہ سنگ ہے

آلودۂ خوں لاکھ ہوں یاں ناخنِ مجنوں
وا پیچِ خمِ زلفِ دوتا ہو نہیں سکتا

جنوں میں خود کو گر کھویا جنوں میں خود کو گر پایا
تو کھونا اور کیا ہوگا تو پانا اور کیا ہوگا

یہ آئینہ خانہ بھی کوئی دامِ جنوں ہے
حیرت سے جو نکلے ہیں تو وحشت میں رہے ہیں

اُٹھانا اِک قدم بھی تھا جنوں کے ضعف سے مشکل
اُٹھا جب اِک قدم طے دشتِ امکاں کرلیا میں نے

لے آئیں چلو دل کی ایسی ہی پڑی ہے تو
بازارِ جنوں میں تو عنقا نہ ہُوا ہوگا

جب سلامت تھا جنوں تب زخم سے ناخن تلک
ایسی تنہائی نہیں تھی ایسی بے کاری نہ تھی

زنجیر نے کچھ رنگ بھرا تو ہے جنوں میں
لیکن یہ خرد بخشیِ زنجیر بھی کب تک

بس میں اُس کے بھی کہاں پردہ کشائی آخر
کہو مجنوں سے کہ اب مِنّتِ لیلیٰ نہ کرے

اِس خاک ِبے دلی سے اُٹھے کس طرح یہ دل
اب وہ جنوں رہا نہ وہ شدّت ہی رہ گئی

جنوں کے مارے ہوئے تیغ سے گلے مِل کر
کسی سے وصل کی حسرت تمام کرکے چلے

قدموں کے ساتھ ساتھ رہا حلقۂ جنوں
آنکھوں کے آگے آگے وہی اِک پری رہی

مِرا جنوں جو گریباں کے ہوش سے گُزرا
نہیں رہا ترے جلوے کو بھی نقاب کا ہوش

کفِ جنوں سے عشق کو نکال کر مثالِ مہر
کوئی کہو میں کیا کروں کہ یہ بھی کام کرلیا

خرد سر تھام کر گزری، جنوں دل تھام کر گزرا
مسافر کب سلامت کوئے تنہائی سے گزرے ہیں

اگر ہوں جیب و گریبان و دامن و دل چاک
کہاں کہاں سے یہ وحشت بھلا چھپائے کوئی

خطِ چہار گرہ سے مرے جنوں کو نہ ناپ
جنوں کی پوچھ مرے چاکِ بے رفو پہ نہ جا

کہوں تو کیا جو بتاؤں تو کیا کہ یوں ہے جنوں
یہی کہوں یہی کہتا رہوں جنوں ہے جنوں

نہ پوچھ سر کی کہ یہ ہوشِ سنگ سے بھی گیا
جنوں کی پوچھ جنوں سے بھی کچھ فزوں ہے جنوں

ہم ایسے خونیں کفن جس کی تہہ کے ہیں پیراک
وہ دام و موجہ و گرداب و بحرِ خوں ہے جنوں

کشید کرتا ہے نشّہ خود اپنی خلوت سے
شریکِ محفلِ مَے جامِ واژگوں ہے جنوں

یہ عمرِ خس تو کٹی منّتِ ہَوا میں تمام
اُڑی جو راکھ کھُلا شعلۂ دروں ہے جنوں

خیالِ دیر نہ فکرِ بُتاں نہ ہوش اپنا
جنوں سہی مگر اب اِس قدر بھی کیوں ہے جنوں

قطرہ و دریا

کسی بھی جزو میں گر کُل نہ ہوتا پوشیدہ
کسی بھی قطرے میں دریا چھپا نہیں ہوتا

''میں'' کو ''تو'' قطرے کو یم نے کو نوا ہونے سے کام
ہر سِوا کو ہے یہاں تو ماسوا ہونے سے کام

قطرے سے ہے دریا میں تلاطم پسِ ہر موج
قطرہ جو نہ ہوتا تو یہ دریا بھی نہ ہوتا

جو دریا کو ہے کرتا خاک کرکے خاک کو دریا
وہ بے آواز دبے رفتار دریا کون دیکھے گا

قطرہ نہیں دریا ہے جو دریا میں ہے شامل
قطرہ کبھی دریا میں فنا ہو نہیں سکتا

میں جز و کُل کا تماشا نہیں کہ کھل جاؤں
کسے خبر کہ میں قطرہ ہوں اور نہ دریا ہوں

ہے کو نہیں بنا کے ، بنا کے نہیں کو ہے
دریا کو قطرہ ، قطرے کو دریا کیا گیا

جب مجھ پہ کھل گیا یہ تماشائے جز و کل
قطرے کو موت آ گئی دریا بھی مر گیا

نے جز و کل ، نہ قطرہ و دریا نہ میں نہ تو
ھا کے سوائے ھُو کے علاوہ نہ میں نہ تو

کچھ وسُعتِ قطرہ نہیں جز تنگیِ دریا
قد ہو نہ سکا بڑھ کے بھی قامت سے زیادہ

کبھی قطرہ ، کبھی دریا، بھی قلزم کی طرح
ایک حالت میں تو رہنا ہی نہیں چاہیے ہے

تہہ کو نہ وہ معلوم نہ ساحل کو یہ معلوم
وہ اندروں قطرہ ہے کہ دریا ہے وہ بیرون

قطرے سے نہ دریا سے نہ قلزم سے کسی سے
کرتا جو نہیں کوئی تقاضا وہی ہوں میں

تہہ میں مجھے کیا چھوڑ گئی تندیِ امواج
مدت ہوئی دریا مجھے دریا نہیں لگتا

جب آنکھ کھلی قطرے میں دریا نظر آیا
ذرّے میں کبھی دل کبھی صحرا نظر آیا

یہ بھی کیا عالمِ حیرت ہے کہ اپنا ہی وجود
کبھی قطرہ کبھی دریا نظر آتا ہے مجھے

موج کے بعد فقط موج نہیں پیشِ جنوں
ایک دریا پسِ دریا نظر آتا ہے مجھے

ہر وقت یہ قلزم یونہی ٹھہرا ہوا پایا
ہر وقت یہ دریا یونہی بہتا ہوا دیکھا

کب جزو میں کُل آخر یکجا نہ ہوا ہوگا
ہے کون سا قطرہ جو دریا نہ ہوا ہوگا

بے کرانی کا سراب اُس پہ جو کُھلتا پسِ شوق
قطرہ خود کو نہ کبھی شاملِ دریا کرتا

کون جانے گا وہ تنہائی جو گزری مجھ پر
ہاں مگر وہ کہ جو قطرے کو گہر جانتے ہیں

محوِ حیرت ہیں تماشا پہ بہت ماہی و موج
قطرہ لایا ہے تہہِ آب سے گوہر کی خبر

وہ جس قطرے پہ جز و کل کی نسبت کُھل گئی ہوں گی
وہ قطرہ کب رہا ہوگا وہ دریا ہوگیا ہوگا

ہے ایک ہی حقیقتِ امکانِ جز و کل
دریا میں قطرہ ،قطرے میں دریا تلاش کر

آئینہ خانہ ہے کچھ اور پسِ بود و نبود
ایک قطرہ کہ ہے موجود مگر نا موجود

بحر میں ہے تو یہ ہے بحر گہر پھر بھی نہیں
ہاں جُدا بحر سے رہنا ہی ہے قطرے کا وجود

یہ تماشا پسِ دیدارِ نظر ہوتا ہے
قطرہ تنہائی سے گزرے تو گہر ہوتا ہے

دیکھ سکتی ہے فقط عقل یہ منظر تنہا
ذرّۂ ریگ ہے صحرا کے برابر تنہا

حجم سے کیا تلُے تنہائی جو یکساں ہو وجود
جتنا قطرہ ہے ، ہے اتنا ہی سمندر تنہا

بے خبر ہونا کہ خود آپ خبر ہوجانا
عشرتِ قطرہ ہے قطرے کا گہر ہوجانا

گزر کر خود سے ہو تے ماورائے قطرہ و دریا
گزر جاتے وہ خدّ و خال و قامت سے گزر جاتے

میں اور تُو

یہ تنہائی یہ میرا دل یہ میرا آئینہ خانہ
یہاں ''تم'' بھی اگر ''میں'' ہوں تو پھر یہ دوسرا کیا ہے

سوائے وہم حقیقت میں کچھ نہ ہوتا ''تو''
جو درمیان میں ''میں'' کا سرا نہیں ہوتا

میں کو ''تو''، قطرے کو یم نے کو نوا ہونے سے کام
بر سوا کو ہے یہاں تو ماسوا ہونے سے کام

وہ جو ''میں'' بن کے مجھ پہ ٹوٹی ہے
وا دریغا میں وہ قیامت ہوں

اے دل یہاں جب تک مِرا ہونا نہ ہو ثابت
واللہ کسی بات کا ہونا نہیں کچھ بھی

جو سامنے ہو اور گُم بھی ہو جو ''میں'' بھی ہو اور ''تم'' بھی ہو
جو دید بھی ہو نادید بھی ہو دیدار اُسی کو کہتے ہیں

''میں'' سے جو صرف کاڑھی رہی ''میں''
میں وہ تنہائی میں وہ فرصت ہوں

کہتے ہیں ''میں'' کو ہستیِ آدم پہ داغ ہے
یہ داغ ہے تو اِس کا نہ دھونا بھی عشق ہے

''تو'' سے ''میں'' تک ہے جو پھیلا ہوا نورِ موجود
''میں'' کا ملک ہے کبھی وہ کبھی ہم کا مالک

''میں'' سے لے کے ''تو'' تلک ''تو'' سے لے کے ''میں'' تلک
میں ہوں آپ ہی جواب میں تھا آپ ہی سوال

''تو'' کا در بند ہوا اور کھلا ''مَیں'' کا در
ایک حیرت سے نکل کر نئی حیرت میں ہوں

تجھے خبر نہ ہوئی ''تو'' سے کب ہُوا ''میں'' تو
رہا تو مستِ مئے ساغرِ الہٰ سائیں

اس میں کیا نصف ''تو'' ہے پوشیدہ
اے حقیقت سوال میں کیا ہے

طے ہوا ''تو'' سے ''میں تک کا یہ فاصلہ اے خدا الوداع
شکریہ مجھ کو مجھ تک جو پہنچا دیا اے خدا الواداع

یہ میں کو ''تو'' یہ ''تو'' کو ''میں'' بنا کے
بہم اندر جدا کی بات کی ہے

ہر لمحہ محوِ جست رہو
اِس ''میں'' اِس ''تو'' سے نکل آؤ

آپ ہی ''میں'' اور آپ ہی تو آپ ہی چاک اور آپ
آپ ہی سر اور آپ ہی سنگ میں ہُوں بے کشکول ملنگ رفو

''تو'' سے میں تک کا سفر میرے سفر کا ہے گواہ
یعنی آئینِ من و تو نہیں بدلا میں نے

جو اِس کنارے پہ ''میں'' تھے نہ اُس کنارے پہ ''تو''
وہ خود میں ڈوب گئے خود کو پار کرتے ہوئے

یہ اور بات کہ ''تو'' میں بھی ''میں'' نظر آیا
مگر وسیلہ نما آئینہ ہُوا کہ نہیں

مکاں کی قید سے نکلے تو یہ کُھلے تجھ پر
کہ تیری ''میں'' سے کئی لا مکاں گزر رہے ہیں

جو ''میں'' کو پہنچا تو جانا کہ ''تو'' کو پہنچا میں
میرے پتے سے ہی تیرا پتا ہوا کہ نہیں

چھپا کے خود کو تو گم کر دیا ہے ''تو'' کا سرا
مجھے جہان میں ''میں'' کا سرا بنایا ہے

جانے ''ھا'' ہے جانے ''ھو'' ہے جانے ''میں'' ہے جانے ''تو'' ہے
جانے کدھر کو نکلا تھا میں جانے کدھر تک آ پہنچا ہوں

اک فاصلے سے ''تو'' جیسے پڑھتا ہُوا تھا میں
دیکھا قریب جا کے تو لکھا ہوا تھا ''میں''

حیرت کدے میں عشق کے تخلیق کرکے ''میں''
یوسف بنا دیا کہ زلیخا بنادیا

بتا یہ کس کی ہے ''میں'' اور بتا یہ کس کی ہے تو
یہ کون کس سے ہے ظاہر یہ کون کس میں چھپا

سنو ''میں'' سے ''تو'' تک سنو ''تو'' سے ''میں'' تک
ہے سب کے لیے آئینہ اپنا اپنا

پھر اٹھ کے دوڑ لگا ماء و تُو کے بیچ نوید
نہ تجھ کو ھُو کی خبر ہے نہ تجھ ھَا کا پتا

''مَیں'' لگاتی ہے یہ نعرہ پسِ ہر نعرۂ ھُو
تو مِرا تو ہے سرِ ہستیِ دل میں ترا تو
''مَیں'' جب اک عالمِ اثبات میں ''مَیں'' سے گزری
تو کی صہبا سے لبالب ہوا تب ''مَیں'' کا سہو
تو میں رہتے تھے جو گم آپ میں دونوں ''مَیں'' تھے
رفت یا بود نہ تھے عشق میں دونوں ''ہیں'' تھے

آپ عاشق ہے یہ میں آپ ہی محبوب یہ میں
آپ طالب ہے یہ میں آپ ہی مطلوب یہ میں
بچ ہی سکتی نہیں ''مَیں'' آپ میں ''مَیں'' کی زدَ سے
آپ غالب ہے یہ میں آپ ہی مغلوب یہ میں
ایک تنہائی کا صحرائے لق و دق ہے یہ میں
''میں'' سے آگاہ ہو گر ''مَیں'' تو انالحق ہے یہ میں

تو مردِ عشق انالحق تری نوا سائیں
خدا نہیں پہ خدا سے نہیں جدا سائیں

تجھے خبر نہ ہوئی ''تُو'' سے کب ہُوا ''مَیں'' ''تُو''
رہا تو مستِ مئے ساغرالہٰ سائیں

وہ تو کہ آپ ہی عاشق ہے آپ ہی معشوق
ملے گا اور کہاں تجھ سا مبتلا سائیں

تو عشق تھا بہ خدا حسن ہو گیا آخر
وہ ابتدا تھی تیری یہ ہے انتہا سائیں

نوؔید بھی ہے مسافر رہِ اناالحق کا
یہی ہے وقت کچھ اُس کے لیے دعا سائیں

جس کا ''میں'' جزو ہے وہ کُل ہے انائے مطلق
''میں'' سے ''میں'' تک کا تسلسل ہے انائے مطلق

''تو'' کبھی ''میں'' سے گزر تجھ پہ بھی کھُل جائے گا
تُو کی خاموشی میں ایک غُل ہے انائے مطلق

''مَیں'' میں ''تُو'' بھر کے بنادیتی ہے جو مست الست
''تُو'' کی مینا کی وہ قُل قُل ہے انائے مطلق

جو عطا کرتی ہے ہر عقل کو مستی کا شعور
وہ تدبر وہ تعقل ہے انائے مطلق

وہ کبھی ''میں'' کی خبر پا ہی نہیں سکتا ہے
واسطے جس کے تغافل ہے انائے مطلق

میری ''مَیں'' کو ''تُو'' کا جو سودا سمایا
تو خود کو ہی خود کا ہی جلوہ دکھایا

کسے یہ خبر ''تُو'' سے ظاہر ہوا ''مَیں''
میری شکل میں ''تُو'' نے خود کو چھپایا

نظر آیا میں ''تُو'' کی صورت میں خود کو
میری ''مَیں'' نے ''تُو'' سے جو پردہ ہٹایا

کھُلا عرش پر ''مَیں'' کا ''تُو'' میزباں تھا
کہ ''تُو'' نے ہی تھا مَیں کو مہماں بلایا

نہیں کوئی ''تُو'' اب نہیں کوئی ''مَیں'' اب
میں تجھ میں سمایا تو مجھ میں سمایا

نے جز و کل، نہ قطرہ و دریا، نہ میں نہ تو
ھا کے سوائے، ھو کے علاوہ، نہ میں نہ تو

ہجر و وصال سے جو گزر آئے تو کھلا
'میں' اور'تو' کے بیچ میں پردہ، نہ میں نہ تو

معدوم سا جو 'میں' ہے، جو'موہوم' سا ہے ''تُو''
'میں' اور'تو' کے بیچ وہ نقطہ، نہ میں نہ تو

'ہے' گم ہوئی' نہیں' میں، نہیں 'ہے' میں گم ہوئی
'میں' اور 'تو'کے بیچ رہا کیا، نہ میں نہ تو

'میں' اور 'تو' کے بیچ تھی، بس ایک 'ھو' کی دیر
پھر کچھ نہیں تھا 'ہونا' نہ 'ہونا'، نہ میں نہ تو

آئینہ

دید کو ایک ہوئے پیش و پسِ آئینہ
جو ہے جیسا مجھے ویسا نظر آنے لگا ہے

آپ ہی تو ہیں روحِ حقیت اگر آپ ہیں
آئینے کے اُدھر کچھ نہیں ہے اِدھر آپ ہیں

آئینے پر جمی ہوئی حیرت کو دیکھنا
کیا بار بار ایک ہی صورت کو دیکھنا

کارِ مجذوب تو کچھ ہے بھی نہیں اِس کے سوا
آئینہ دیکھتے آئینہ دکھاتے چلیے

اُس آئینے کے آگے گئے تھے ہم ایک بار
وہ روشنی پڑی کے جھلس ہی گئے جناب

نہ جانے ذہن میں کیا اُس کے ہے تصّور حُسن
کہ اُس پری کو سنورنے کا بھی خیال نہیں

سنوارنے میں کوئی مر رہا ہے زُلف اپنی
کسی کو زُلف بکھرنے کا بھی خیال نہیں

میں نے کیا دیکھا پسِ آئینہ ہست و وجود
ہائے جب خود کو ہی میں نے نہیں دیکھا، کہ میں ہُوں

سماجاتی نگاہِ ''ھُو'' میں روحِ آئنہ خانہ
جو کثرت سے گُزر جاتے تو وحدت سے گزر جاتے

فُرصتِ آئینہ بینی نے کیا پیدا یہ شوق
ورنہ صورت کو کہاں تھا آئنہ ہونے سے کام

وہ حُسن اپنی آئینہ بینی میں گُم رہا
ہم اپنے انتظار سے آگے نکل گئے

نہ پوری طرح لطیف اور نہ پوری طرح کثیف
میں خود ہی آئنہ میں خود ہی بال آدمی ہوں

ہوں چشمِ آئنہ میں برہنہ کچھ اِس طرح
بے جّبہ و عبَا و قبا ہے مِرا وجود

گُزر کے آئنہ خانے سے دل میں تیر ہوئی
اگر اُٹھی ہے کبھی یہ نگاہِ حسرت ناک

معلولِ محض و بے رُخِ علّت کہیں جسے
صورت خود آئنہ ہو کہ حیرت کہیں جسے

ملبوس کوئی بھی نہیں قیامت کے برابر
یہ آئنہ خانہ نہیں حیرت کے برابر

میں جاں سے وہ آئینۂ خود بینی سے گزرا
اب حُسن ہوا میری محبّت کے برابر

میں ہوں خود ہی آئنہ میں ہوں خود ہی حیرتی
عشق یعنی میری تاب حُسن یعنی میرا حال

ابھی نہیں ہوں سرِ آئنہ ابھی ہوں میں
وہ شعبدہ ہوں کہ خود اپنا حیرتی ہوں میں

میں آئنوں کا مکیں خود تجھے صدا دوں گا
مجھے تلاش نہ کرمجھ میں زاویے ہیں ہزار

جو چشمِ عشق تہہِ بارِ آئنہ ہے تو یہ
سزا ہے یا کہ جزا ہے مجھے نہیں معلوم

یہ خلا کی بے وجودی یہ وجودِ چشمِ حیراں
اِسی آئنے سے پیدا اِسی آئنے میں پنہاں

تو یہ آئنہ بھی کیوں ہو جو وہ موجِ حُسن یوں بھی
پَسِ آئنہ چھپی ہو سرِ آئنہ ہو عریاں

وہ حیرتی ہُوں آئنہ خانے کے درمیاں
جس کو سراغِ ہستیِ آئنہ گر نہ ہو

بنے ہیں چشمِ تغیّر اِس ایک حسرت میں
جہاں کو آئینۂ کہکشاں میں دیکھنا ہے

یہ وہ قامت ہے جسے ملبوسِ یکتائی ہے کم
یہ وہ چہرہ ہے کہ جس کو آئنہ کافی نہیں

پردے میں وہم کے ہے حقیقت خدا گواہ
گھیرے ہے آئنے کو یہ حیرت خدا گواہ

آئنے میں اب اپنے خدوخال دیکھ کر
تکتی ہے میرا منہ مِری صورت خدا گواہ

حیرتی ہوں چشم کے آگے دھرا ہے آئینہ
مستقل دیکھو تو جانو اک بلا ہے آئینہ

کچھ نہیں مقصودِ چشمِ عشق حیرت کے سوا
آنکھ جو رکھتا ہے اُس کا مدّعا ہے آئینہ

کس کے ٹھہرائیں مماثل کیا رکھیں تمثیل میں
کس سے دیں تشبیہ آخر آئینہ ہے آئینہ

میں نے دیکھا تو نہیں اُس کا بدن لیکن یہ ہے
کیا قیامت ہوگا وہ جس کی قبا ہے آئینہ

اب نگہ حائل نہیں لے دیکھ یہ رنگِ وصال
چشم خوں آلود ہے ٹوٹا پڑا ہے آئینہ

اب بے بسی میں دوڑتا رہ ''کیا'' سے ''کیوں'' تلک
حسرت ہے آئنے کی تو حیرت کو اب نہ رو

جو چکا دے وہ آئنہ لے جائے
قیمتِ آئنہ تحیّر ہے

خود کو اے محوِ آئنہ داری
آئنوں سے گزر کے دیکھ ذرا

وہ آئنہ نظر آیا جو مجھ سے گرد ہٹی
پھر اُس کے بعد مجھے دُوسرا دکھائی دیا

ایک حیرت تھی سو اب وہ یاس ہے کیا کیجیے
درمیانِ چشم و آئینہ رہا کچھ بھی نہیں

سنو 'میں' سے 'تو' تک، سنو 'تو' سے 'میں' تک
ہے سب کے لیے، آئینہ اپنا اپنا

جانے کیا ہو رہے ہیں راز و نیاز
حیرتی چپ ہے، آئینہ چپ ہے

ہزار چہرہ و آئینہ کی دوئی میں نوؔید
جوخود میں چہرہ ہو، وہ آئینہ ملا کہ نہیں

آئینے میں کیا ڈھونڈیے حیرت سے زیادہ
صورت میں تو کچھ بھی نہیں صورت سے زیادہ

پردہ اُلٹ کے ہست کا آئینۂ الست کا
میں بھی کمال ہوگیا تم بھی کمال ہوگئے

عکس بہ عکس سر بہ سر رنگ بہ رنگ تر بہ تر
خوب ہے اُس کے حسن کو آئینۂ مکانِ دل

ہائے رہے پیشِ آئنہ آئینہ داریاں تری
ہم تھے کہ آئنے کو دیکھ اپنے حواس کھو رہے

میں ہوں خود ہی آئنہ میں ہوں خود ہی حیرتی
عشق یعنی میری تاب حُسن یعنی میرا حال

جو خبر ہے آئینہ ہے جو ہے آئینہ خبر ہے
نہ کوئی خبیر و مخبر نہ کوئی نظیر و ناظر

مجھی سے چشم کی حیرت مجھی سے تابِ طلسم
کہ آئنہ بھی ہوں میں آئنہ طراز بھی میں

کدھر سے دیکھئے، دکھلایئے کدھر سے بھلا
ہے آئنے میں وجود آئینہ وجود میں گم

نوعِ آدم خیرہ چشمِ شیشۂ بود و عدم
کرتی رہتی ہے نہ جانے آب و گِل میں کیا تلاش

چشمِ بینا کو تو دونوں حالتیں ہیں ایک سی
آئنے پر گرد ہو یا سطحِ آئینہ ہو صاف

قامت کے برابر کوئی آئینہ نہیں ہے
یوں خود کو جو دیکھا قدِ آدم ہی تو دیکھا

حیرت میں رہ کہ عرصۂ نظّارہ تنگ ہے
جھپکی اِدھر پلک اُدھر آئینہ زنگ ہے

خاموش آئینہ تکے جاتا ہے روز و شب
اِس حیرتی پہ آئینہ خانہ بھی دنگ ہے

گر آئینے کو لگے وہ بھی زنگ ہوجائے
وہ روگ ہم کو خدا کی قسم لگا ہے میاں

دیکھا ہے کیا کہ گُم کیا حیرت میں اپنا آپ
چپ چپ کھڑے ہوئے ہو یہ تم آئینہ سے کیا

اِک بار جو دیکھا اُسے یوسفؑ کی نظر سے
آئینہ گزرگاہِ زلیخا نظر آیا

اتنا شفّاف ہے یہ آئینۂ کون و مکاں
سانس لیتا ہوں تو دھندلا نظر آتا ہے مجھے

وحشتِ عشق کہاں مِنّتِ آئینہ کہاں
یاں تو دیوار میں چہرہ نظر آتا ہے مجھے

کچھ نظر آتا تو ہے دہر کے آئینے میں
نہیں معلوم مگر کیا نظر آتا ہے مجھے

جب طلسمِ آئینہ خود ہو نقابِ آئینہ
چشم پر کیسے حجابِ آئینہ خانہ کُھلے

کُھلا وہ چشم اندر چشم ہے بیدار و خوابیدہ
جو آئینہ در اندر آئینہ کُھلنے سے پہلے تھا

جس حسن کا عاشق ہوں میں اس حُسن کو میں نے
بے منّتِ آئینہ سنورتا ہوا دیکھا

باز آیا آئینے سے، یہ کہتا ہوں اب تو بس
منہ دیکھنے کو آئینہ دیکھا کروں گا میں

کرلے رخِ ہزار سے نظّارۂ وجود
اے چشمِ گُل یہ آئینہ گلزار پھر نہیں

اُس بزم میں بھی اپنی ہی خلوت میں رہے ہیں
آئینہ تھے آپ اپنی ہی حیرت میں رہے ہیں

یہ آئینہ خانہ بھی کوئی دامِ جنوں ہے
حیرت سے جو نکلے ہیں تو وحشت میں رہے ہیں

کیا ہٹائے سرِ آئینہ سے گردِ وحشت
اب تو چہرہ ہی نہیں آئنہ بردار کے پاس

اک تجسّس تھا کہ تھا بس ایک حیرت ہے کہ ہے
آئینہ ہونے سے پہلے آئینہ ہونے کے بعد

بس اِک جھلک، اُسے بھی ہُوئے عمر ہوگئی
پر آئینے کی آنکھ سے حیرت نہیں گئی

پلکوں پہ گردِ عمرِ تماشا لیے ہوئے
اِک چشم آئینے کو ہے حیراں کیے ہوئے

کب نہ تکتے تھے بھلا چشمِ ستارہ سے اُسے
کب وہ شکلِ مہ غریقِ آئینہ داری نہ تھی

اے موت نیستی ہے آئینہ کس جہاں کا
تک تک کے جس کو دنیا ہستی میں ڈھل رہی ہے

آئینہ گرد سے پیدا ہے سیاہی سے کرن
یاں اندھیرا ہی اندھرا ہے نظر آنے تک

یوں نہ خود کو سرِ آئینہ تماشا کرتا
چشم ہوتی نہ میں حیرت کی تمنا کرتا

حسن جو آپ ہو قامت میں قدِ آئینہ
اُس پہ حیرت کے سوا آئینہ بھی کیا کرتا

خود کو پانے کی تمنا میں نہ کھودے خود کو
اس سے کہنا کہ بہت آئینہ دیکھا نہ کرے

آئینے میں کیا ڈھونڈتی ہے اب نگہِ دہر
جو کھو گئے آئینے میں حیرت میں ملیں گے

گناہگار ہوئے اور پاکباز رہے
کہ ہم غبار میں بھی آئنہ طراز رہے

ایسی خلوت ہے کہاں آئینہ حیراں ہے بہت
کوئی جاتا ہے کہیں جا کے سنور آتا ہے

آئینے گرد ہوگئے حیرت ہی رہ گئی
کارِ جنوں کے باب میں فرصت ہی رہ گئی

اب نظر آ کہ تھک رہا ہوں میں
کب سے آئینہ تک رہا ہوں میں

آئینہ سا وہ رو بہ رو ہے مِرے
اور پلکیں جھپک رہا ہوں میں

یہ آئینہ ہے یہ میں ہوں وہ وقت ہے جس نے
نگاہ کرنے کی فرصت ہی چھین لی مجھ سے

اِک جا کیا نازک مجھے شیشے سے زیادہ
اِک جا کیا پتھر تری بے داد گری نے

ہے زنگِ خزانِ آئینہ ہے رنگِ بہارِ آئینہ
ہاں دشت اِسی کو کہتے ہیں گلزار اِسی کو کہتے ہیں

ہمارے آئنے میں تو بس اپنے حسن کو دیکھ
ہمارے نالہ و فریاد و ہاؤ ہُو پہ نہ جا

میں تجھ میں ہی موجود ہوں آئینے کی صورت
تو کیسے یہ سمجھے گا سنور جانے سے پہلے

کچھ ایسی آکے پڑی درمیاں فنا کی گرہ
جو آئنہ سی تھی صحبت ہے رو بہ رو برہم

یہ اور بات کہ ''تُو'' میں بھی ''مَیں'' نظر آیا
مگر وسیلہ نما آئنہ ہُوا کہ نہیں

میں کہ جوہر بھی ہوں اور آئنہ خانہ بھی ہوں
میری کمیابی میں پوشیدہ ہے وافر ہونا

جو چاہو سو دیکھو جی تم جب تک چاہو دیکھو جی تم
آئینہ ہے میرا بے زنگ میں ہوں بے کشکول ملنگ

دیکھی جو خود کی آئینۂ ہست میں جھلک
مجھ کو یہی لگا کہیں دیکھا ہُوا تھا میں

طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئنہ
گویا حریمِ حسن میں داخل ہے آئنہ
جب آئنہ وجود ہے جب آئنہ شہود
پھر کیا کہیں کہ کس کے مماثل ہے آئنہ

آئنہ کُن ہے اور فیکوں کائنات ہے
وسعت میں اس کی دائرۂ شش جہات ہے

ہے ثبت ہر دوام پہ آئینے کا دوام
یہ رَو بہ رَو قطار میں چہروں کا اژدھام
اِک رُو نہ سطحِ وقفے کے قابل نظر پڑی
دیکھا بہ رنگِ آبِ رواں آئنہ تمام

اِک آئنے میں ایک سے چہرے تھے سب رواں
چشم و مژہ و ابرو و رخسار ولب رواں

اِک سیل ہے یہ آئنہ اِس کے سوا ہے کیا
اس رَو میں حال و ماضی و فردا بھلا ہے کیا
اِس کا جواب ڈھونڈتی پھرتی ہے موجِ وقت
پھر بھی ہے یہ سوال وہیں آئنہ ہے کیا

اِس آئنے ہی سے رُخِ خورشید زرد ہے
اِس آئنے کے آگے تو یہ وقت گرد ہے

اِس آئنے کی تاب کوئی لائے کیا مجال
لب کیا ہلیں پلک کا جھپکنا یہاں محال
حیرت ہی کرسکے تو کچھ اِس سے کرے کلام
حیرت ہی پر کُھلے گی یہ خاموشیِ جمال

مانا کہ خامشی کی بہت تہہ دبیز ہے
حیرت تو خامشی سے بھی آگے کی چیز ہے

آئینہ ہی جنوں ہے یہ آئینہ ہی پری
اے چشم آئنے سے گزر یوں نہ سرسری
عریاں ہے اِس کے حسن سے ہیبت جمال کی
پیدا ہے اِس سے خاک کے پُتلے میں تھرتھری

اِس آئنے کے آگے قضا و قدر ہے کیا
اِس آئنے سے آگے بھی کچھ ہے مگر ہے کیا

آئینۂ خرد میں کچھ آتا تو ہے نظر
پر کیا ہے اور کیوں ہے یہ کھلتا نہیں مگر
ہر دم دکھا رہا ہے نیا رنگ آئنہ
اور چشم کہہ رہی ہے برابر دِگر دِگر

یہ چشم کم نہیں ہے یہ آئینہ کم نہیں
اس ربط کے وجود کا کوئی عدم نہیں

آئینہ وہ ہے جس میں کہ چہرہ دکھائی دے
ماضی کو دیکھنے چلیں، فردا دکھائی دے
آئینہ وہ ہے جس میں تغیّر کا ہو سراغ
قطرے کو دیکھنے چلیں، دریا دکھائی دے

خیرہ ہو چشمِ دل وہ تماشا نظر پڑے
ہو آئنہ ہی آئنہ جس جا نظر پڑے

حسرت ہے جس کی باغ کو وہ گل ہے آئنہ
اِک نور ہے کہ جس کا تسلسل ہے آئنہ
وہ سیلِ رنگ ہے کہ ٹھہرتی نہیں نگاہ
ہے جزو گر کہیں تو کہیں کل ہے آئنہ

دیکھو تو اور ہی ہے تماشائے آئنہ
طوطی کے لب پہ ہے ہمہ دم ہائے آئنہ

شفّاف اس قدر ہے کہ شیشہ ہے آئنہ
یوں ہے کہ سانس لینے سے دھندلا ہے آئنہ
اپنی چمک میں حیرتِ یوسفؑ لیے ہوئے
اِک عمرِ انتظارِ زلیخا ہے آئنہ

یہ بات صرف یوں ہی نہیں بلکہ یوں بھی ہے
آئینہ عشق بھی ہے خرد بھی جنوں بھی ہے

آئینہ دیکھنا ہمہ وقت اِک وبال ہے
آئینہ دیکھنا ہمہ وقت اِک کمال ہے
ماضی ہے چشمِ ہوش کو آئینۂ جہاں
چشمِ جہاں نما کو تماشائے حال ہے

جو دیکھتی ہے چشمِ تماشا ہے گم کہیں
ماضی کی تہہ میں عرصۂ فردا ہے گم کہیں

آئینہ تہہ بہ تہہ ہے تری چشم تہہ بہ تہہ
آئینہ گر خموش ہے تو بھی خموش رہ
آئینے کے سوال کا حیرت سے دے جواب
اس سیلِ خامشی میں خموشی کے ساتھ بہہ

اپنی فنا ثباتِ تغیّر میں گم تو کر
تو خود کو آئنے کے تحیّر میں گم تو کر

ہے آئینے کی تہہ میں فلک آئنے کو دیکھ
جھپکے نہ خیرگی سے پلک آئنے کو دیکھ
اِس آئینے سے خود کو بھی تو آئینہ بنا
شفاف آپ ہونے تلک آئنے کو دیکھ

دیکھ اِس طرف بھی دیدۂ حیراں اُٹھا کے دیکھ
یہ بارِ آئنہ سرِ مژگاں اُٹھا کے دیکھ

جو دیکھتی ہے چشم دکھاتا ہے آئنہ
کھوئے ہوئے کو آپ میں لاتا ہے آئنہ
اِک وزن چشمِ محو نظارہ پہ ڈال کر
اِک وزن ہے کہ خود پہ اُٹھاتا ہے آئنہ

تقسیمِ وزن ہی سے تو قائم ہے ربطِ دید
آئینے کو دوام ہے دائم ہے ربطِ دید

آئینے کے ازل کو ابد ہم نے کر دیا
اے وقت جا بھی اب تجھے رَد ہم نے کر دیا
تسبیح کو سبو سے بدل کر خدا کو آج
بالاتر از شمار و عدد ہم نے کر دیا

اُٹھتا نہ تھا یہ بارِ جنوں پر اُٹھا لیا
اس دستِ ناتواں نے یہ ساغر اُٹھا لیا

اے آئنے ہم عشق ہیں جانا ہے کیا ہمیں
چل دیں جو ایک بار تھمے سے نہیں تھمیں
مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
جب آئنے کے سامنے ہم آکے ھُو کریں

ہم آئنے سے اور یہ آئینہ ہم سے ہے
یہ وحدتِ نظارہ ہمارے ہی دم سے ہے

آگے ہو کیا سخن کہ ابھی تک سوال ہے
میں کیا ہوں اور کیا میری تابِ جمال ہے
ہستی کو سوچتا تھا کہ آیا خیالِ دام
پھر آئنہ جو دیکھا تو دیکھا کہ بال ہے

گو آئنہ میں جلوۂ نا پید و پید ہوں
کھلتا مگر نہیں ہے کہ میں کب سے قید ہوں

لا

کیا کہا جائے کیا لکھا جائے
چپ رہا جائے ''لا'' لکھا جائے

وہ رنگ لائے کہاں سے کہ جس کی ''لا'' ہے نمود
بنائے کس طرح ممکن مُحال کی صورت

کیوں کیسے بنامِ عجز رمز لا الٰہ کیا ہے
نہیں کھلتا الٰہ کے ساتھ بہ الحاقِ ''لا'' کیا ہے

فقط ''لا'' کے اضافے سے ہے گر محدود لا محدود
تو لا محدود بھی محدود ہے اِس کے سوا کیا ہے

ہم تو کیا ہوتے کیا نہیں ہوتے
''لا'' ہی ہوتے جو ''لا'' نہیں ہوتے

اگر یہ ساری حقیقت ہے ''لا'' میں پوشیدہ
تو کیا الٰہ نہ ہوتا جو ''لا'' نہیں ہوتا

میں ''لا'' ہوں اس زمان و مکاں کی حدود میں
ہے تنگ مجھ پہ میری ہی وسعت خدا گواہ

وجود ہوں نہ میں موجود ہوں ، نہ میں ''لا'' ہوں
نہ آئنہ ہوں نہ صورت ہوں کیا کہوں کیا ہوں

سوائے وہم نہیں کچھ نہیں وجود کا ''لا''
نہ کر خیال کا پیچھا خیال پر مت جا

یہ مانا مل گیا تجھ کو ''الٰہ'' کا مفہوم
مگر بتا کہ نہ معلومِ ''لا'' ملا کہ نہیں

یہ تم نے جو خدا کی بات کی ہے
تو در پردہ ''لا'' کی بات کی ہے

تو کیا لا ابتدا کی بحث کرکے
کس لا انتہا کی بات کی ہے

کس کو جانا ہے حقیقت کسے ''لا'' سمجھا ہے
کچھ تو سمجھا مجھے اے وہم کہ کیا سمجھا ہے

سب ہے ترا قیاس ترا وہم کیا کہوں
نے ''صفر'' ہے نہ ''لا'' ہے تری آنکھ بند ہے

تجھے خبر ہے کہ اِس تہہ میں کتنے ''لا'' گم ہیں
نہ ڈھونڈ ہم کو خلا ہے ہماری تنہائی

بتا مجھے تو اے محدود ''لا'' کی حد کیا ہے
بقا کی حد ہے فنا تو فنا کی حد کیا ہے

جب ہو گیا جواب تو ''لا'' تک بکھر گیا
جب تھا سوال نقطے میں سمٹا ہوا تھا میں

صفر سے پہلے بھی ''لا'' ہے صفر کے بعد بھی ''لا''
کھلا تو بس یہ کھا ہے کہ کچھ نہیں ہے کھلا

خود سے ملتے نہیں اور ''لا'' کا سرا ڈھونڈتے ہیں
جنہیں انساں نہیں ملتا وہ خدا ڈھونڈتے ہیں

اوّل ہو کہ آخر ہو وہ مثبت ہو کہ منفی
بنیاد میں ہر صفر کی ''لا'' ہے کہ نہیں ہے

جب میں حدِ زمان و مکاں سے نکل گیا
سب مر گئے شمار و عدد ''لا'' بھی مر گیا

کیا کرو کیا وجود کرلو ''لا''
اور کتنا خیال دوڑاؤ

اثباتِ ہستِ ذات میں ہے نفی میری ذات
یا کائناتِ عشق کا ''لا'' ہے مرا وجود

جب چشم نے حدود سے جانا ہے لا حدود
پھر جو ہے یاں شہود وہ یعنی وجود ہے

جب خدا سے بھی خلا پر نہ ہُوا سینے کا
میں بھی ''لا'' ہوگیا سینے میں خلا ہونے سے

جو تیرے دل میں خلا تھا خدا ہوا کے نہیں
وجود سا تھا جو تجھ میں، وہ ''لا'' ہوا کے نہیں

ہے ''کیا'' کے سفر کا حاصل ''لا''
تم سُو سے بہ سُو سے نکل آؤ

ھُو

نہ کوئی ''میں'' نہ کوئی ''تو'' نہ امکاں
بس اب میں ''ھُو'' کی خلوت چاہتا ہوں

یعنی پاتا ہوں میں اب عالمِ ھُو میں خود کو
یعنی قیدِ سحر و شام سے آزاد ہُوا

خُم خانہ الست میں جامِ شرابِ ھُو
قطرے کو مست کر دیا دریا بنا دیا

عالمِ ھُو دلِ بینا کو نظر آئے گا
یعنی ہر حیرت و حسرت سے گزر جائیں گے ہم

نہ میں ہے نہ تو ہے نہ یہ ہے نہ وہ ہے
وہاں صرف ھُو ہے جہاں جا رہا ہوں

اک ''ھُو'' مچا کے داخل و خارج بھی کیا گئے
''میں'' کا دُروں بھی ''تو'' کا بُروں بھی چلا گیا

بس ایک ''ھَا'' کی صدا ہے بس ایک ''ھُو'' کی صدا
یہ کیا مقام ہے جانے خودی رہی نہ خُدا

میں نے کیا جانا نہیں جانا اگر عالمِ ھُو
میں نے کیا پایا اگر خود کو نہ پایا کہ میں ہُوں

کیا میری ''میں'' کے مجھے میں بھی تو ''تو'' نے دی ہے
جبکہ ہونے کی خبر حالتِ ''ھُو'' نے دی ہے

تنہائی میں نہ گم ہو نہ یکتائی میں ہو قید
کر ایک ''ھُو'' کی جستجو اک ''ھا'' تلاش کر

میں کیا ہوں کون ہوں کیوں ہوں کہاں ہوں کس لیے ہوں میں
سوالِ ہست ہوں ''ھُو'' میں چھپایا جا رہا ہوں میں

نے جزو و کل نہ قطرہ و دریا نہ میں نہ تو
ھا کے سوائے ھُو کے علاوہ نہ میں نہ تو

''میں'' اور ''تو'' کے بیچ تھی بس ایک ''ھُو'' کی دیر
پھر کچھ نہیں تھا، ہونا نہ ہونا نہ ''میں'' نہ ''تو''

اسیرِ کثرتِ جلوہ نہ ہوتے قیدِ یکتائی
پہنچنے عالمِ ''ھُو'' میں جو خلوت سے گزر جاتے

سماجاتی نگاہِ ''ھُو'' میں روحِ آئنہ خانہ
جو کثرت سے گزر جاتے تو وحدت سے گزرجاتے